

تفہیم القرآن

العصر

نام | پہلی آیت کے لفظ العصر کو اس کا نام قرار دیا گیا ہے۔
 زمانہ نزول | اگرچہ مجاہد، قتادہ اور مقاتل نے اسے مدنی کہا ہے، لیکن مفسرین کی عظیم
 اکثریت اسے مکی قرار دیتی ہے۔ اور اس کا مضمون یہ شہادت دینا ہے کہ یہ مکہ کے بھی
 ابتدائی دور میں نازل ہوتی ہوگی جب اسلام کی تعلیم کو مختصر اور انتہائی دل نشین فقروں میں
 بیان کیا جاتا تھا، تاکہ سننے والے ایک دفعہ ان کو سن کر بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھول سکیں اور
 وہ آپ سے آپ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ جائیں۔

موضوع اور مضمون | یہ صورت جامع اور مختصر کلام کا بے نظیر نمونہ ہے۔ اس کے اندر چند چھٹے نفا
 میں معنی کی ایک دنیا بھر دی گئی ہے جس کو بیان کرنے کا حق ایک پوری کتاب میں بھی مشکل سے ادا کیا
 جا سکتا ہے۔ اس میں باکل دو ٹوک طریقہ سے بتا دیا گیا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کون سا ہے
 اور اس کی تباہی و بربادی کا راستہ کون سا۔ امام شافعی نے بہت صیح کہا ہے کہ اگر لوگ اس
 سورۃ پر غور کریں تو یہی ان کی ہدایت کے لیے کافی ہے۔ صحابہ کرام کی نگاہ میں اس کی اہمیت
 کیا تھی، اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حسن الداری ابوذر ثنیہ
 کی روایت کے مطابق اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے جب دو آدمی ایک دوسرے
 سے ملتے تو اس وقت تک جدانہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۃ عصر نہ سننا لیتے (طرائف)۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے
زمانے کی قسم، انسان درحقیقت خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لاتے،
اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

لہٰذا اس سورتہ میں زمانے کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے، اور اس خسارے
سے صرف وہی لوگ بچے ہوتے ہیں جن کے اندر چار صفتیں پائی جاتی ہیں: (۱) ایمان - (۲) عملِ صالح (۳) ایک
دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا - (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ اب اس کے ایک ایک جز کو الگ
لے کر اس پر غور کرنا چاہیے تاکہ اس ارشاد کا پورا مطلب واضح ہو جائے۔

جہاں تک قسم کا تعلق ہے، اس سے پہلے بارہا ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے
مخلوقات میں سے کسی چیز کی قسم اُس کی عظمت یا اُس کے کمالات و عجائب کی بنا پر نہیں کھائی ہے، بلکہ اس
بنا پر کھائی ہے کہ وہ اُس بات پر دلالت کرتی ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔ پس زمانے کی قسم کا مطلب
یہ ہے کہ زمانہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ انسان بڑے خسارے میں ہے سوائے اُن لوگوں کے جن میں یہ
چار صفتیں پائی جاتی ہوں۔

زمانے کا لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گزرتے ہوئے زمانے کے دینے
جس میں حال درحقیقت کسی لمبی مدت کا نام نہیں ہے۔ ہر آن گزر کر باضی بنتی چلی جا رہی ہے، اور ہر آن اگر
مستقبل کو حال، اور جا کر حال کو ماضی بنا رہی ہے۔ یہاں چونکہ مطلقاً زمانے کی قسم کھائی گئی ہے، اس لیے
دونوں طرح کے زمانے اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ
انسانی تاریخ اس بات پر شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی ان صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے
میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ
لیجیے کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے وہ دراصل وہ وقت ہے جو ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کو دنیا میں
کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اُس کی مثال اُس وقت کی سی ہے جو امتحان گاہ میں طالب علم کو پرچے حل
کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے

اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرنے ہوتے دیکھنے سے آپ کو ہوجائے گا۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اسی ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل کا راستہ طے کرتی ہے، اور خدا کی خدائی میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ہوں خواہ وہ ابھی تک ہمارے علم میں نہ آئی ہوں۔ تاہم اگر وقت کے گزرنے کی رفتار وہی سمجھ لی جائے جو گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کے چلنے سے ہم کو نظر آتی ہے، اور اس بات پر غور کیا جائے کہ ہم جو کچھ بھی اچھا یا بُرا فعل کرتے ہیں اور جن کاموں میں بھی ہم مشغول رہتے ہیں وہ سب کچھ اس محدود مدتِ عمر ہی میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو دنیا میں ہم کو کام کرنے کے لیے دی گئی ہے، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا اصل سرمایہ تو یہی وقت ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ امام رازی نے کسی بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ "میں نے سورہ عصر کا مطلب ایک برفِ خروش سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھٹا جا رہا ہے، رحم کرو اس شخص پر جس کا سرمایہ گھٹا جا رہا ہے اُس کی یہ بات سن کر میں نے کہا یہ ہے وَالْعَصْرُ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ کا مطلب۔ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھٹنے کی طرح تیزی سے گزر رہی ہے۔ اس کو اگر ضائع کیا جائے، یا غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے۔ پس گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلتِ عمر کو صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سوردے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے منصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ہم اُس طالب علم سے جو امتحان کے مقررہ وقت کو اپنا پرچہ حل کرنے کے بجائے کسی اور کام میں گزار رہا ہو، کمرے کے اندر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اشارہ کر کے کہیں کہ یہ گزرتا ہوا وقت تباہا ہے کہ تم اپنا نقصان کر رہے ہو، نفع میں صرف وہ طالب علم ہے جو اس وقت کا ہر لمحہ اپنا پرچہ حل کرنے میں صرف کر رہا ہے۔ انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے، لیکن بعد کے فقرے میں اُس سے اُن لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے منصف ہوں، اس لیے لامحاذہ یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں لفظ انسان اسم جنس کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اُس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام، اور پوری نوعِ انسانی پر کیا ہوتا ہے۔ پس یہ حکم کہ مذکورہ چار صفات سے جو بھی خالی ہو وہ خسارے میں ہے، ہر حالت میں ثابت ہوگا، خواہ ان سے خالی کوئی شخص ہو، یا کوئی قوم، یا دنیا بھر کے انسان۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم اگر یہ حکم لگائیں کہ نہ ہر انسان کے لیے مہلک ہے تو اس کا

مطلب یہ ہوگا کہ زہر بہر حال مہلک ہے خواہ ایک فرد اس کو کھائے، یا ایک پوری قوم، یا ساری دنیا کے انسان مل کر اسے کھا جائیں۔ زہر کی مہلک خاصیت اپنی جگہ اُل ہے، اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک شخص نے اس کو کھا یا ہے، یا ایک قوم نے اسے کھانے کا فیصلہ کیا ہے، یا دنیا بھر کے انسانوں کا اجماع اس پر ہو گیا ہے کہ زہر کھانا چاہیے۔ ٹھیک اسی طرح یہ بات اپنی جگہ اُل ہے کہ چار مذکورہ بالا صفات سے خالی ہونا انسان کے لیے خسارے کا موجب ہے۔ اس قاعدہ کلیہ میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ایک شخص ان سے خالی ہے، یا کسی قوم نے، یا دنیا بھر کے انسانوں نے کفر، بد عملی، اور ایک دوسرے کو باطل کی ترغیب دینے اور بندگی نفس کی تلقین کرنے پر اتفاق کر لیا ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ خسارے کا لفظ قرآن مجید کس معنی میں استعمال کرتا ہے لغت کے اعتبار سے خسارہ نفع کی ضد ہے، اور تجارت میں اس لفظ کا استعمال اُس حالت میں بھی ہوتا ہے جب کسی ایک سودے میں گھٹا آئے، اور اُس حالت میں بھی جب سارا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو، اور اُس حالت میں بھی جب اپنا سارا سرمایہ کھو کر آدمی دیوالیہ ہو جاتے۔ قرآن مجید اسی لفظ کو اپنی خاص اصطلاح بنا کر فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے، اور جس طرح اُس کا تصور فلاح محض دنیوی خوشحالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی کامیابی پر جاوی ہے، اسی طرح اُس کا تصور خسارہ بھی محض دنیوی ناکامی یا خستہ حالی کا ہم معنی نہیں ہے بلکہ دنیا سے لے کر آخرت تک انسان کی حقیقی ناکامی و نامرادی پر جاوی ہے۔ فلاح اور خسارہ، دونوں کے قرآنی تصور کی تشریح اس سے پہلے ہم متعدد مقامات پر کر چکے ہیں اس لیے ان کے اعادے کی حاجت نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراب، حاشیہ ۹۱، الانفال، حاشیہ ۳۰۔ یونس، حاشیہ ۲۳۔ بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۲۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۷۔ المؤمنون، حاشیہ ۱-۲-۱۱-۵۰۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۴۔ الزمر، حاشیہ ۳۴۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگرچہ قرآن کے نزدیک حقیقی فلاح آخرت میں انسان کی کامیابی، اور حقیقی خسارہ وہاں اُس کی ناکامی ہے، لیکن اس دنیا میں بھی جس چیز کا نام لوگوں نے فلاح رکھ چھوڑا ہے وہ دراصل فلاح نہیں ہے بلکہ اُس کا انجام خود اسی دنیا میں خسارہ ہے، اور جس چیز کو لوگ خسارہ سمجھتے ہیں وہ دراصل خسارہ نہیں ہے بلکہ اس دنیا میں بھی وہی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور ہر جگہ ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم،

المخل. حاشیہ ۹۹۔ جلد سوم، مریم، حاشیہ ۵۳، ظنہ، حاشیہ ۵۰۔ جلد ششم، اللیل، حواشی ۲-۵۳۔ پس جب قرآن پورے زور اور قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ ”درحقیقت انسان بڑے خسارے میں ہے“، تو اس کا مطلب دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے، اور جب وہ کہتا ہے کہ اس خسارے سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کے اندر حسبِ ذیل چار صفات پائی جاتی ہیں، تو اس کا مطلب دونوں جہازوں میں خسارے سے بچنا اور فلاح پانا ہے۔

اب ہمیں ان چاروں صفات کو دیکھنا چاہیے جن کے پستے جانے پر اس سورۃ کی رو سے انسان کا خسارے سے محفوظ رہنا موقوف ہے۔

ان میں پہلی صفت ایمان ہے۔ یہ لفظ اگرچہ بعض مقامات پر قرآن مجید میں محض زبانی اقرارِ ایمان کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً النساء، آیت ۱۳۷۔ المائدہ، آیت ۵۴، الانفال، آیت ۲۰، ۲۷، التوبہ، آیت ۳۸، اور الصف، آیت ۲ میں)، لیکن اس کا اصل استعمال سچے دل سے ماننے اور یقین کرنے کے معنی ہی میں کیا گیا ہے، اور عربی زبان میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔ لغت میں اَمَنَ لَدُنَّ کے معنی ہیں صَدَّقَهُ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ (اس کی تصدیق کی اور اُس پر اعتماد کیا)، اور اَمَنَ بِهِ کے معنی ہیں اَلْيَقَنَ بِهِ (اُس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے، اُس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے:

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور پھر شک میں نہ پڑے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا (المحجرات، ۱۵)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَفْتَمُوا (رغم السجدہ، ۳۰)

مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَرَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ (الانفال، ۲)

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ، ۱۶۵)

پس نہیں، (اے نبی) تمہارے رب کی قسم وہ ہرگز

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ

فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا -

(النساء - ۶۵)

مومن نہیں ہیں جسبت تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں
تہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو
اُس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ
سرسبر تسلیم کر لیں۔

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے
کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ

(النساء - ۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے
رسول پر۔

اب رہا یہ سوال کہ ایمان لانے سے کن چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے، تو قرآن مجید میں پوری طرح اس بات کو بھی
کھول کھول کر بیان کر دیا گیا۔ اس سے مراد اولاً اللہ کو ماننا ہے محض اُس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اُسے اس حقیقت ماننا ہے کہ وہی
ایک خدا ہے۔ خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ وہی اس کا مستحق ہے کہ انسان اُس کی عبادت، بندگی اور
اطاعت بجالائے۔ وہی تمہیں بنانے اور بگاڑنے والا ہے۔ بندے کو اسی سے دعا مانگنی چاہیے اور اسی پر توکل کرنا
چاہیے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے والا ہے۔ بندے کا فرض ہے کہ اُس کے حکم کی اطاعت کرے اور جس چیز سے
اُس نے منع کیا ہے اُس سے رک جائے۔ وہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے۔ اُس سے انسان کا کوئی فعل تو
درکنار، وہ مقصد اور نیت بھی مخفی نہیں ہے جس کے ساتھ اُس نے کوئی فعل کیا ہے۔ ثانیاً، رسول کو ماننا۔ اس حقیقت
سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے، اور جس چیز کی تعلیم بھی اُس نے دی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف
سے ہے، برحق ہے، اور واجبِ تسلیم ہے۔ اسی ایمان با رسالت میں ملائکہ، انبیاء اور کتبِ الہیہ پر، اور خود قرآن
پر بھی ایمان لانا شامل ہے، کیونکہ یہ اُن تعلیمات میں سے ہے جو اللہ کے رسول نے دی ہیں۔ ثانیاً، آخرت کو ماننا
اس حقیقت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی پہلی اور آخری زندگی نہیں ہے، بلکہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ
زندہ ہو کر اٹھنا ہے، اپنے اُن اعمال کا جو اُس نے دنیا کی اس زندگی میں کیے ہیں خدا کو حساب دینا ہے، اور
اس محاسبہ میں جو لوگ نیک قرار پائیں انہیں جزا، اور جو بد قرار پائیں ان کو سزا ملنی ہے۔ یہ ایمان اخلاق اور
سیرت و کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر دیتا ہے جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی
ہے۔ ورنہ جہاں سرے سے یہ ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں انسان کی زندگی خواہ کتنی ہو خوشنما کیوں نہ ہو اُس کا

حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو موجود کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پڑ سکتا۔ ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات ذکیہ کا مولد پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اُس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو، اور وہ اُس ہدایت کی پیروی میں نہ کیا جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اُس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتاتے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں ختمی نشانیں بھی دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لاکر عمل صالح کریں، اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظِ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان کی خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

مذکورہ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد یہ سورۃ دو ضروری صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں، اور وہ یہ ہیں کہ یہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اقل تو ایمان لانے اور ذکیہ عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اس لیے اُس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہونا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔ حق کا لفظ باطل کی ضد ہے، اور بالعموم دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق

عدل و انصاف اور مطابقتِ حقیقتِ بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا نیکوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔ پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا ہے جس نہ ہو کہ اُس میں باطل سد اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمہ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں، اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو باپال ہونے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۃ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا (آیات ۷۸-۷۹)۔ پھر اسی بات کو سورۃ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سنت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو اُن پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اُس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے (آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶)۔ اور اسی بات کو سورۃ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اُس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو (آیت ۲۵)۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امت مسلمہ کا فرضیہ قرار دیا گیا ہے (آل عمران - ۱۰۴) اور اُس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فرضیہ انجام دے (آل عمران - ۱۱۰)۔

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرطِ لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں، اور اس راہ میں حق تکالیف سے،

جن مشقّتوں سے، جن مصائب سے، اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ ان کا ہر فرد دوسرے کی بہت بندھنا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔ درمیان شریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ششم، الذہر، حاشیہ ۱۹۔ البد، حاشیہ ۱۲۔

”قرآن مجید“

وہ عظیم المرتبت کتاب جو ملت اسلامیہ کے وجود کی محافظ ہے اور جس کا محافظ خود خدا ہے

مگر دور حاضر میں

پاکستان کے محقق جلیل جناب مولانا ظفر اقبال کی تیس سالہ عرق ریزی اور تحقیق کے بعد پیکچر لمب ٹڈ لاہور کی طرف سے شائع ہونے والا تجویدی قرآن مجید اپنی مثال نہیں رکھتا۔ آرٹ بھر، اعلیٰ دورنگی طباعت، حارہ و ف۔ مع بلاسٹک کور۔ خوشنما ڈپے میں بند سائز ۳۰x۲۰۔ صفحات ۱۰۳۲۔ ہدیہ صرف ۳۲ روپے ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

تفہیم القرآن کے اجزاء، البقرہ، المائدہ، یوسف، النور، الاعزاب کے بعد اسلامیات کے

طالب علموں کی سہولت کی خاطر

تفسیر سورۃ الحجرات، سورۃ لقمان

بھی علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں

اب سورۃ الحجرات کا تیسرا اور سورۃ لقمان کا دوسرا ایڈیشن آگیا ہے۔

الحجرات۔ سائز ۲۳x۱۸ صفحات ۵۶۔ آفسٹ سفید کاغذ۔ قیمت نیا ایڈیشن ۸۰۔ ۱ روپہ

لقمان۔ سائز ۲۳x۱۸ صفحات ۶۰۔ آفسٹ سفید کاغذ۔ قیمت نیا ایڈیشن ۵۰۔ ۱ روپہ

ضرورت مند حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے آرڈر سے جلد مطلع فرمائیں۔

ادارہ ترجمان القرآن اچھلا لاہور کو آرڈر دیجیے۔ فون نمبر ۵۲۵۰۷۷